اختتامی کلمات

ڈاکٹر ایس ایم زمان ☆

سیرت طیبہ کا موضوع اور علمائے کرام کا یہ جلیل القدر مجمع ۔ آپ نے ان کے ارشادات سنے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں ان فاضلانہ ارشادات کے تأثر میں کوئی مفید اضافہ کرسکتا ہوں لیکن اس مبارک تقریب میں حاضری اور میری بہن (ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ) کے حکم، دونوں کا یہ اقتضاء ہے کہ چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

اس تقریب کا آغاز مولانا صلاح الدین یوسف کے نہایت خوبصورت خطاب سے ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے خطاب کے عنوان کے مطابق حضور سید وسرور کائنات جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوۃ والتسلیم، ہمارے آقا و مولیٰ، پر ایمان ہی یقیناً دنیا اور آخرت میں نجات کا باعث ہے، سرخروئی کا ذریعہ ہے، فلاح اور کامیابی کا وسیلہ ہے۔ اس کے بغیر سب کچھ نامکمل ہے۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے الفاظ میں ہم تمام زہد وتقویٰ کے باوجود، سب علم وفضیلت کے باوجود، حضورؐ کی ذات گرامی کے ساتھ محبت، اطاعت کا تعلق قائم نہ کرسکیں تو سچی بات یہ ہے کہ سبھی کچھ بے کار ہے۔ (۱) یہ وہ ذات گرامی ہے کہ انسان نے اعمال صالحہ کے خانے میں سب کچھ جمع کر رکھا ہو لیکن ان کے حضور اس کی آواز بھی بلند ہو جائے تو سارے اعمال اکارت ہو جاتے ہیں۔ (۲) ایسی ہستی جو رحمۃ اللعالمین ہے تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے اس سے رحمت کا اکتساب مسلمان ہی نہ کرسکیں تو بے نصیبی اور محرومی کی انتہا ہے۔

حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا تعلق قائم کرنا اس طرح پر کہ حضور ﷺ کی ذات گرامی ہمیں دنیا کی ہر چیز سے عزیز ہو، اپنی جان سے اپنے آباء واجداد سے، اپنی اولاد سے، اپنے اموال سے، تجارت سے، محلات ومکانات سے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں کمال حکمت وبلاغت کے ساتھ فرمایا:

☆ چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد (پاکستان)

''کہہ دو اگر تمہارے آباء، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری عورتیں، تمہاری برادری، مال و دولت جو تم کماتے ہو، تجارت جس کی مندی کا تمہیں دھڑکا رہتا ہے اور مکانات جو تمہیں خوش آتے ہیں، تمہیں زیادہ عزیز ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے، تو انتظار کرو اس وقت کا کہ اللہ اپنا حکم صادر کر دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راہ نہیں دکھایا کرتا''۔(۳)

بلاشبہ ہم میں سے کوئی سرے سے صاحبِ ایمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک ہمارے دلوں میں اللہ پر ایمان اور حضور ﷺ کے ساتھ تعلق، محبت کا، عشق کا، اطاعت کا، فرمانبرداری کا، غلامی کا، اس طرح موجود نہ کہ دنیا کے سارے لوازم حضور ﷺ کے ساتھ اس تعلق کے سامنے حقیر ہوں۔ خود حضور رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

''لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده و ولده والناس اجمعین''(۴)

''تم میں سے کسی کا ایمان اعتبار نہیں پا سکتا، جب تک میری ذات اسے اپنی اولاد اپنے بزرگوں بلکہ کل انسانوں سے زیادہ عزیز نہ ہو''۔

تو یہ تعلق ہے جسے زندہ کرنے کے لیے آج کے اجتماع جیسی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں کہ گاہے گاہے ہم اس یاد کو تازہ کرتے رہیں، اس حرارت سے اپنے سینوں کو گرماتے رہیں۔ اپنے سینوں میں ایمان کی شمع روشن کرتے رہیں۔ اور اس طرح وہ شخصیت تعمیر ہوتی رہے جس شخصیت کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہو کہ اس کی نظروں میں حضور ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ وابستگی کا تعلق تمام دنیاوی لوازم سے بڑھ کر ہو۔ حضور ﷺ کی ذات پر ایمان کا پہلا تقاضا قرآن پر ایمان ہے۔ قرآن کو ہم حضور ﷺ کے واسطے سے پہچانتے ہیں اور قران سے حضور ﷺ کی عظمت ہمارے دلوں میں راسخ ہوتی ہے۔ آج ہم شکایت کناں ہیں۔ آج کی محفل میں بھی بکثرت تذکرہ ہوا ہے کہ آج کی دنیا میں کس طرح ہم مسلمان اکنافِ عالم میں ذلت و رسوائی کے Recieving End پر ہیں۔ ضعف، کمزوری اور کفر کے سامنے مکمل بے بسی ہماری آج کی تصویر ہے۔ اس کا علاج بھی یہی ہے کہ ہم قرآن کے حامل اور

علمبردار بنیں۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

زندگی گزارے کا طریقہ قرآن سے سیکھیں، قرآن کے سہارے سے جیئیں۔ قرآن کو چھوڑ کر ہم کچھ بھی بن سکیں لیکن عزت و وقار کے اتھ مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا تھا:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر　　اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

صداقت کبھی پرانی نہیں ہوتی، کبھی باسی نہیں ہوتی خواہ اسے لاکھوں بار دہرایا جائے۔ یہ مصرعہ ''اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر'' کبھی اپنی حقیت کھو نہیں سکتا۔ آج ہم اپنے اردگرد مسلمان کی خواری کے تذلیل کے، بے بسی کے جو شرمناک مناظر دیکھ رہے ہیں ان کی وجہ ترک قرآن اور حب رسول کا فقدان ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کی شان میں ہلکی سے گستاخی کا کوئی کلمہ سن کر مشتعل تو ہو سکتے ہیں، جلسے جلوس تو نکال سکتے ہیں مگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں، اپنے سید و مولا و مرشد و ہادی کے ارشادات کو سمو نہیں سکتے، ان کی پیروی نہیں کر سکتے، صبح بستر سے اٹھنے کے بعد اور سونے سے پہلے کم و بیش پندرہ سولہ گھنٹوں میں ہمیں قدم قدم پر، لمحے لمحے، سانس بہ سانس کئی فیصلے انسان کی حیثیت سے کرنے پڑتے ہیں۔ صبح مؤذن کی اذان سن کر اٹھا جائے یا آرام کیا جائے، اسی طرح شام تک کئی فیصلے، چھوٹے بڑے، اپنی دوکان پر، اپنے دفتر میں، اپنے سکول و کالج میں، اپنے کاروبار میں ہمیں کرنے ہوتے ہیں ان سب فیصلوں میں ہر لمحے اور ہر وقت یہ یاد رکھنا کہ میرا یہ فیصلہ مجھے میرے آقا و مولا حضور علیہ الصلوۃ والتسلیم کے قریب تر کر دے گا یا ان سے دور کر دے گا۔ یہ حساب جو ایک مومن کو ہر وقت اپنے دل کے ساتھ کرتے رہنا چاہیے اور یہی حساب ضامن ہے اس بات کا کہ ہم اس دنیا میں تذلیل کی بجائے رفعت اور عظمت کے القابات حاصل کر سکیں۔

محترم جناب وائس چانسلر نے اپنے خوبصورت کلمات میں ایک بہت اچھی بات کہی کہ ہمیں اس دنیا میں پھر سے بلند ہونے کے لیے، سچا بننے کی ضرورت ہے۔ مسلمان ہونے کا شاید سب سے

پہلا تقاضا یہی ہے۔ اگر آپ سچے نہیں تو حضورﷺ کی رسالت پر آپ کی گواہی جو شرط ایمان ہے وہ بھی معرض شک میں ہے اور اگر وہ معرض شک میں ہے تو ایمان ہی معرض شک میں ہے۔ حضورﷺ نے غیروں سے صادق اور امین کا جو لقب پایا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی ملت اور آپ کے غلام بھی دنیا میں اس وصف کے ساتھ ممتاز ہوں۔ اپنوں ہی میں نہیں بلکہ اغیار کے درمیان بھی۔ لیکن دوستو! آپ سب کو علم ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری عدالتوں میں جہاں قسم کھا کر گواہی دی جاتی ہے (یہاں بہت سے ایسے بزرگ اور احباب تشریف رکھتے ہیں جو ہماری عدالتوں کے دستور سے، کاروائیوں سے واقف ہیں) شاید پچانوے فیصد یا اس سے زیادہ گواہیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ ممالک جنہیں ہم اخلاق سے عاری تصور کرتے ہیں وہاں شاید پچانوے فیصد یا اس سے زیادہ گواہیاں درست ہوتی ہیں۔ اگر یہی معیار قرار دیا جائے تو ہمیں اپنی خواری اور اپنی ذلت کے سمجھنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہوگی۔

وائس چانسلر صاحب کے بیان میں ایک غلط فہمی کے ازالے کی ضرورت ہے۔ یہ غلط فہمی عام نہیں ہونی چاہیے۔ شاید یہ بات انہوں نے رواروی میں کہہ دی۔ انہوں نے فرمایا کہ ۲۳۷ ق م میں اشوک کی حکومت کے اختتام تک، پھر اس کے بعد محمود غزنویؒ کے آمد، افغانوں کی آمد، پھر مغلوں کی آمد، یہ سب ہمیں Subjugate کرتے رہے۔

یہ انداز فکر غیر حقیقی اور غیر تاریخی ہے۔ اس سوچ کی اصلاح ہونی چاہیے۔ اشوک کا شمار تو ویسے بھی برصغیر میں اسلام کی آمد سے پہلے اچھے اور نیک نام حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا نام تو اس قبیل میں غیر مسلم ہونے کے باوجود نہیں آنا چاہیے۔ اپنے ابتدائی دور استبداد کے بعد اپنی توبہ سے لے کر وفات تک اس نے اپنی قلم رو میں رفاہی کاموں کا وسیع سلسلہ پھیلایا اور جگہ جگہ وہ نصائح، وہ اچھی اور نیک باتیں جو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں کندہ کروائیں۔ اس کے حملہ آور ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تو اسی برصغیر کی پیداوار تھا۔ (۵)

رہا محمود غزنویؒ تو اپنی تاریخ کو خدا کے لیے coloured glasses کے ساتھ نہ

پڑھیں جن کے ساتھ اپنی تاریخ پڑھنے پر ہمیں استعماری قوتوں اور نوآبادیاتی قوتوں نے مجبور کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نہ صرف ہمارے غیر مسلم برادران وطن، ہم سے اور ہماری تاریخ سے متنفر ہوں بلکہ ہم خود اپنی نظروں میں حقیر ہوں۔ یقین کرلیں کہ ہمارے آباء واجداد، ظالم اور لٹیرے تھے، آتے تھے، لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ محمود غزنویؒ کی برصغیر میں آمد، خدا جانے کتنے لاکھوں انسانوں کے لیے باعث برکت ہوئی ہوگی جو ایک شودر کی حیثیت سے جانور سے بدتر، زندگی گزار رہے تھے اور پھر کلمہ حق پڑھنے کے بعد وہ انسانوں کی صف میں برابری اور مساوات کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ بلاشبہ محمود غزنویؒ کوئی بہت بڑا عالم یا مبلغ اسلام نہیں تھا مگر اس کے جلو میں بے شمار علماء وفضلاء اور بزرگ صوفیہ نے سرزمین ہند پر قدم رکھا، جنہوں نے انسانوں کو انسانیت کا درس دیا، جنہوں نے یہ اعلان کیا کہ کوئی شودر سرراہ چلتا ہوا کوئی مقدس منتر سن لیتا ہے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر نہیں ڈالا جاسکتا وہ بھی بنی آدم ہونے کے لحاظ سے انہی حقوق کا حامل ہے جو کسی برہمن کو حاصل ہیں۔ یہی اسلام کی عظمت تھی جو ایسی شخصیتوں کی بدولت برصغیر کے باسیوں تک پہنچی۔ ایک طرف اسلام ایسا ضابطہ حیات ہے جہاں علم کا حصول ہر انسان پر فرض ہے، حق بھی نہیں بلکہ فرض، اور دوسری طرف جو تہذیب اس وقت برصغیر میں موجود تھی اس کے معاشرتی ضابطہ کی رو سے صرف وہی انسان جو اتفاق سے کسی برہمن خاندان میں پیدا ہو جاتے، علم حاصل کرنے کا استحقاق رکھتے تھے دوسرا کوئی شخص علم حاصل کرنے کا مستحق ہی نہیں تھا اور نچلی ذات کے شودر تو انسان ہی نہیں تھے، ان کا سایہ تک ناپاک تھا، وہ صرف برہمنوں کھشتریوں کی سیوا کے لیے عمر بھر ظلم کی چکی میں پسنے کو پیدا ہوئے تھے۔

ایسے لوگوں نے یہاں آ کر جو عظیم انقلاب پیدا کیا، افسوس ہے کہ ہم اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ ہمیں محمود وایاز کی تلمیح میں انصاف اور مساوات انسانی کا جو عظیم درس پوشیدہ ہے وہ یاد نہیں رہتا مگر انگریز مؤرخین کے لکھے ہوئے 1001ء لے کر 1026ء تک سترہ حملے ہمیں یاد رہتے ہیں۔ وہ سترہ حملے سترہ دعوتیں تھیں، جنہوں نے ہندوستان میں علمی ومعاشرتی انقلاب کے دروازے کھول دیئے اور اسلام کی ثروت مند ثقافت کو ہندوستان سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کلچر کے وسط

ایشیاء کے ساتھ رابطوں کی راہ بھی ہموار کردی۔(۵)

مولانا زاہد الراشدی صاحب کا ممنون ہوں اور انہیں مبارکباد دینا چاہوں گا کہ انہوں نے آج کے ماحول کے اعتبار سے نہایت نازک موضوع پر خطاب فرمایا۔ میں پورے شرح صدر کے ساتھ یہ عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے ان کے مقالے سے بہت کچھ سیکھا اور میرے نزدیک ان کا مقالہ حضور سرور کائنات علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کی سیرت طاہرہ کے ایک زندہ معالعہ کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

ہمیں اپنے مخصوص حالات میں حضور ﷺ کی سیرت کے تمام ادوار سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے، سیرت کے ایسے ہی فکر انگیز مطالعوں سے ہم اس راہ کے راہ نورد بن کر بالآخر منزل مقصود کو پاسکتے ہیں۔

اسی فکر جس میں معروضیت بھی ہو، زمینی حقائق کا لحاظ بھی ہو، توسع بھی ہو، توازن بھی، عملیت بھی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور ﷺ کی ذات پاک سے محبت بھی ہو۔ یہ چیزیں جمع ہو کر ہی ہمیں سیرت طاہرہ سے صحیح معنوں میں رہنمائی حاصل کرنے کی ضامن بن سکتی ہیں۔

آپ نے جو خوبصورت باتیں کہیں ان پر میں میں کوئی اضافہ تو نہیں کرسکتا، نہ ان پر ملاحظات پیش کرسکتا ہوں مگر شاید ایک دو باتیں جو میرے ذہن میں آئی ہیں عرض کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ مذہب کے لیے جو جہاد ہے یقیناً دو dimensions کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی طرف خود مولانا نے بھی اشارہ فرمایا لیکن میں اس کی تکرار اس لیے کررہا ہوں کہ اس کی اہمیت ہے۔ ایک جہاد بالسیف ہے اشاعت مذہب کے لیے، اپنا مذہب اختیار کرنے پر دوسرے لوگوں کو مجبور کرنے کے لیے ایک رخ ہے اور اس کے بارے میں بھی ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ دوسری جہت دین کے دفاع کے لیے جہاد ہے۔ اس دوسری dimension میں تو کلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ آج جہاں بھی مسلمان جہاد بالسیف کریں گے، جارحیت (aggression) کے لیے کہاں کریں گے؟ اتنی ہمت کہاں ہے؟ مگر جہاد بالسیف ہرگز ہمارے

لائحہ عمل سے منسوخ نہیں ہے بلکہ ہمارے لائحہ عمل کا ناگزیر جزو ہے بشرطیکہ ہم اس کی جملہ شرائط ملحوظ رکھیں۔

مثلاً بدترین حالت میں بھی اس ناچیز کے نزدیک، ہرگز درست نہیں ہے کہ کوئی شخص بازار میں جا کر ایک بم رکھ دے اور وہ اشخاص جن سے اس بم رکھنے والے کو کوئی شکایت نہیں بلکہ اسے اندازہ ہی نہیں کہ کون اس سے متاثر ہوگا معصوم بچہ ہوگا یا کوئی عورت ہوگی سودا سلف خریدنے والی، کوئی غریب عورت مزدوری کرنے والی، کوئی غریب بندہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ٹوکرا اٹھانے والا، وہ سب اس کا شکار ہوں اس کی کوئی اجازت نہیں۔ ناچیز کے نزدیک اس کا کوئی جواز نہیں کسی شکل میں بھی۔ اسے ہمارے جہاد بالسیف سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صریحاً دہشت گردی ہے اور مکمل طور پر ہر شخص کی طرف سے مذمت کی متقاضی ہے۔

لیکن یہ دہشت گردی-------- جس کا شور آج کل مچ رہا ہے۔ وہ صرف ایک پردہ ہے ایک غلاف ہے اسی لیے تو اس کے define کرنے میں اتنا تامل ہے ان لوگوں کو جو اتنا شور مچا رہے ہیں اسے ختم کرنے کا، اس کے مکروہ ہونے کا، اس کے ذلیل ترین فعل ہونے کا، آخر تک اس کا پیچھا کرنے کا۔ وہ بات جو ان کے حکیم ان کے پروفیسرز، ان کے فلاسفرز چند سال پہلے نظریات پیش کرنے کے پردے میں کہہ رہے تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر S. Huntington کی طرح جس نے اسے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا، بعد میں تھوڑی سی پسپائی بھی اختیار کی۔ اس نے کہا تھا کہ اب نظریات کا نہیں بلکہ تہذیبوں کا تصادم ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ کمیونزم کو جو ہمارا مخالف نظریہ تھا، جمہوریت اور سرمایہ داری کے مقابل، اسے ہم دفن کر چکے، دفن نہیں کر چکے تو کم از کم اس کی کمر توڑ چکے اور اب تہذیبوں کا تصادم ہوگا۔ ان کے نزدیک جو مغربی طرزِ زندگی ہے اپنے تمام مضمرات (implications) کے ساتھ، سوشل لائف میں، پولیٹیکل لائف میں، اکنامک لائف میں، مغربی طرزِ زندگی، مغربی تہذیب ان تمام مضمرات کے ساتھ، اب اس کا تصادم ہے۔ ظاہر ہے اس تہذیب کے ساتھ ہی یہ تصادم ممکن ہے جو اپنے اندر مخصوص نظریات رکھتی ہو، ان سارے پہلوؤں کے

بارے میں، معیشت کے بارے میں، سیاست کے بارے میں، عائلی قوانین کے بارے میں۔ ان کے نزدیک اب واحد ہدف اسلام ہی ہے۔ تو وہ تہذیبوں کے تصادم کی آڑ میں یہ سب کچھ کہتے ہیں اور ہم ان کی duplicity کا رونا روتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کی تعریف ایک جگہ پر کچھ اور کرتے ہیں دوسری جگہ کچھ اور کرتے ہیں۔ یہ ہماری اپنی سادہ لوحی ہے۔ ہمارا اپنا ابلہ پن ہے کہ ہم یہ نہیں پہچانتے کہ وہ تہذیبوں کے تصادم کا اعلان کر چکے ہیں تو آپ ان سے یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ وہ فلسطین کے بارے میں بھی وہی پالیسی اختیار کریں، اسرائیل کے اندر اسرائیلی دہشت گردی کو بھی اسی نظر سے دیکھیں جس نظر سے وہ کسی مسلمان ملک میں، یا کسی بھی مسلمان تنظیم یا فرد کی طرف سے ظاہر ہونے والی دہشت گردی کو دیکھتے ہیں۔

مولانا نے بڑی حکمت کے ساتھ کعب بن اشرف کے قتل کا ذکر کیا، ہمارے آقا و مولا اور سرورِ کائنات ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے کے جرم میں۔ لیکن میں اسے دہشت گردی نہیں کہوں گا اس طرح بحث کو الجھانا نہیں چاہیے۔ وہ دہشت گردی نہیں تھی۔ اس نے ایک Head of the State کے بارے میں، ایک ریاست کے بارے میں، ریاست کو، اس کی بنیادوں کو، اس کے سیٹ اپ کو، اس کی ساخت کو، اس کی حیثیت کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک مہم شروع کی تھی اس لیے وہ ایک outlaw تھا۔

He was declared as an out law, so any body who killed him could not be accused of committing any crime.

آج کی حکومتیں بھی کسی شخص کو outlaw قرار دے دیتی ہیں بلکہ اس کے سر پر انعام مقرر کر دیتی ہیں۔ کوئی شخص جو ریاست کے قوانین کی اس طرح خلاف ورزی کر رہا ہے کہ اس کے شر کو ختم کرنے کے لیے ریاست اس کے سر کی قیمت مقرر کر دیتی ہے کہ جو شخص بھی اسے زندہ پکڑ کر لے آئے یا موت کے گھاٹ اتار دے، نہ صرف یہ کہ وہ قانون کی نظروں میں مجرم نہیں ہوگا بلکہ اسے انعام بھی ملے گا۔ یہ اسی قسم کی مثال تھی اور جیسا کہ مولانا نے وضاحت فرما دی کہ ابو بصیر کی جو چھاپہ مار کارروائیاں تھیں اس میں

رسول اکرمؐ کی کوئی پشت پناہی شامل نہیں تھی اگر چہ آپ نے اس کے نتائج کو قبول فرمایا۔ مغربی ادب میں رابن ہڈ کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ غریبوں کے ہمدرد و مربی کے طور پر مورد تعریف و توصیف ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہ کون تھا، ایک ڈاکو تھا جس نے غریبوں پر مظالم سے متاثر ہو کر زندگی کا یہ طریق اختیار کیا کہ جنگل میں رہتا تھا۔ امیروں پر ڈاکے ڈالتا تھا۔ لوٹی ہوئی دولت حاجت مندوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ابوبصیر بھی ظلم کے خلاف نبرد آزما تھے۔

مختصر بات یہ ہے جسے ہر فاضل مقرر نے دہرایا یہی وقت کی آواز ہے سیرت کانفرنسیں منعقد کیجیے کہ یہی وہ متبرک اجتماعات ہیں جن سے ہمارے اذہان وقلوب کی آبیاری ہوتی ہے۔ ہمارے ایمان کو استحکام حاصل ہوتا ہے لیکن یہ ایمان کا استحکام، یہ ذہنوں کی آبیاری اسلام کی عملی خدمت کے لیے وقف ہونی چاہیے۔ ہمارے عمل کے سانچے میں بھی ڈھلنی چاہیے اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر بلاشبہ یہ سارے اجتماعات بے فائدہ ہیں۔

ہمیں رب کریم کے حضور یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم ایسے اجتماعات سے، وہ سب ثمرات حاصل کریں وہ سب برکات حاصل کریں جو ایسے اجتماعات سے سبق حاصل کر کے اپنے عمل کا حصہ بنا کر یقیناً حاصل کی جا سکتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است (ارمغان حجاز)

۲۔ ﴿لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم و انتم لا تشعرون﴾ (سورۃ الحجرات/۲)
صحیح البخاری، کتاب الایمان، حدیث ۱۵، بروایت انسؓ

۴۔ موریہ خاندان کے آخری بڑے بادشاہ اشوک (۲۶۵۔۲۳۸ ق م یا بقول بعض ۲۷۳۔۲۳۲ ق م) نے اپنی حکومت کے آٹھویں سال میں کالنگا (موجودہ ریاست اڑیسہ) کی خونریز فتح کے بعد پشیمان ہوکر بدھ مت اختیار کیا اور دھرم (حیات مستقیم کے اصول) کے پرچار کے لیے پاٹلی پتر (پٹنہ) سے افغانستان تک متعدد کتبے چٹانوں اور ستونوں (لاٹھوں) پر کندہ کرائے۔ تمام مذہبی فرقوں کے ساتھ احترام اور آزادی کا برتاؤ کیا۔ رفاہ عامہ کے لیے ہسپتال تعمیر کرائے، کنوئیں کھدوائے اور سڑکوں کے کنارے درخت لگوائے۔ جانوروں پر ظلم کے خلاف احکام جاری کیے۔ کئی سٹوپہ اور بدھ مت کی خانقاہیں بھی اس کی یادگار ہیں۔ اس کے کتبوں میں سے حسب ذیل اقتباس اس کے مسلک کی ترجمانی کرتا ہے:

''تمام لوگ میرے بچے ہیں۔ اپنے بچوں کے لیے میری خواہش ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت کی فلاح اور مسرت مہیا کی جائے۔ میری یہی خواہش سب لوگوں کے لیے ہے''۔

(انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، پندرھواں ایڈیشن میکرو پیڈیا، جلد دوم، آرٹیکل بعنوان "Asoka")

۵۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ نگار سلطان محمود (۳۶۱ھ/۹۷۱ء۔۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کی رواداری، رعیت پروری اور علمی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Though a zealous champion of Islam, he never treated his Indian subjects harshly nor did ever impose the Islamic religion on them. He maintained a large contingent of Hindu troops....Conversion to Islam was never a condition of service in the sultan's army.... Mahmud's conquest of northern India fruthered the exchange of trade and ideas between the Indian subcontinent and the Muslim world. It helped to disseminate Indian culture in foreign lands. Similarly, Muslim culture, which by now had assimilated and developed the cultures of such ancient peoples as the Egyptians, the Greeks, the Romans, and the Syrians, found its way into India, and many Muslim scholars, writers, historians, and poets began to settle there``.

(انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، پندرھواں ایڈیشن، آرٹیکل بعنوان "Muhmud of Ghazna")